قرآن اور عقل

تمہید:

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دین میں عقل کا کوئي دخل نہیں ہے، ہم عقل کے ذریعہ دین کو نہیں سمجھ سکتے، یا دین کا عقلاني دفاع نہیں ہو سکتا، دین کچھ کہتا ہے تو عقل کچھ اور، دین کو سمجھنا ہے تو صرف قرآن اور حدیث سے سمجھا جاسکتا ہے؛ عقل سے نہیں !

نصوص[1] اور عقل میں مطابقت ضروري نہیں ہے. اگر عقل سے دین سمجھ لیا جاتا تو انبیاء و مرسلین، قرآن و احادیث کي کیا ضرورت تھی؟ لہذا دین کے ہوتے ہوئے کم سے کم دینی مسائل میں عقل کا کوئي دخل نہیں ہے؛ عقل کي نارسا کمند ڈال کر دین کے اعلیٰ و ارفع معارف تک رسائي حاصل نہیں کي جاسکتی. عقل اور دین میں کیا نسبت؟ کیا تقابل؟! کہاں عقل ، کہاں دین ... !

لیکن کیا واقعي ایسا ہی ہے؟ کیا واقعي دین اور عقل میں کوئي رابطہ نہیں پایا جاتا؟ کیا واقعي دین، عقل کے، اور عقل، دین کے خلاف ہے؟ مختلف مذاہب کے علماء اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟ قرآن کریم کا کیا فرمان ہے؟...؟

عقل اور علماء دین

عدلیہ[2] عام طور سے، چاہے امامیہ[3] ہوں یا معتزلہ[4]، عقل کو معتبر جانتے ہیں؛ ان کے نزدیک ظواہر نصوص اور عقل میں مطابقت ضروري ہے... دین کا کوئي دستور عقل کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

---

[1]) نصوص :یعنی دینی متن ؛ قرآن اور حدیث کے متن کو "نص" کہا جاتا ہے؛ اس کی جمع ہے : نصوص۔

[2]) کیونکہ معتزلہ اور امامیہ لوگ عدل کو اصول دین میں سے مانتے ہیں لہذا انہیں عدلیہ کہا جاتا ہے ؛ عدل کے مسئلہ کو اگر دیکھا جائے تو اس کی بازگشت مسئلہ حسن و قبح عقلی کی طرف ہوتی ہے ؛ اس طرح بنیادی طور سے یہ مسئلہ، عقل کی حجیت اور عدم حجیت سے مربوط ہے ؛ ورنہ خداوند عالم کے اور بھی صفات ہیں، انہیں اصول دین میں شامل نہیں کیا؛ کیا وجہ ہے اسی پر اتنا زور ہے ؟! اور ایسا بھی نہیں ہے کہ غیر عدلیہ، خدا کو عادل نہیں بلکہ ظالم مانتے ہوں ! در اصل اختلاف کی جڑ حسن و قبح عقلی کا مسئلہ ہے ۔

[3]) علم کلام میں اہل بیت کے پیرو کاروں، یعنی شیعہ حضرات کو زیادہ تر " امامیہ " کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ؛ جس طرح فقہ میں خاص کر فقہ مقارن میں " جعفریہ " کے نام سے جانا جاتا ہے ۔

[4]) **مکتب اعتزال**، دوسری صدی ہجری میں " واصل بن عطاء " کے ذریعہ ایجاد ہوا ؛ اس مکتب میں عقل کو بہت اہمیت دی گئی ہے؛ اسی لئے ان آثار میں جمود، کٹّرپنتی، اور شدّت پسندی کے بجائے، نہایت سلجھا ہوا اسلوب پایا جاتا ہے؛ اسی بنا پر بہت مغربی ماہر مشرقیات نے معتزلہ کی بہت تعریفیں کی ہیں ؛ اور دیکھا دیکھی احمد امین یا محمد ابو زہرہ جیسے بہت مصری، تونسی، اور لبنانی مصنفین نے بھی وہاں اشعری مزاج کے بر خلاف مکتب اعتزال کے دفاع کی جرأت کی ہے۔

ان کے مقابلہ میں اہل حدیث، حنابلہ، اشاعرہ، اور سلفیہ[5] ہیں جو اس طرح ظواہر نصوص کے پابند اور ہر قسم کے تعقل کے خلاف ہیں کہ خداوند عالم کے صفات خبری[6] کو لیکر تجسیم وتشبیہ کو بھی تسلیم کر بیٹھے ہیں... البتہ ان میں سے بعض لوگ، تجسیم وتشبیہ سے بچنے کے لئے توقف یا تفویض کا سہارا لیتے ہیں[7]... لیکن بہر حال عقلی کاوشوں کو معتبر نہیں مانتے.

معتزلہ کے بہت عقائد، خاص کر توحید اور عدل کے سلسلہ میں، امامیہ سے بہت ملتے جلتے ہیں؛ اسی لئے دونوں کو "عدلیہ" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے ؛ البتہ دونوں مکتب جدا ہیں اور ان میں فرق بھی بہت ہے حتی توحید اور عدل کے سلسلہ میں بھی فرق بہت ہے ۔ کہا جاتا ہے واصل بن عطاء نے اپنے عقائد کی تبیین میں امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی تعلیمات سے بہت استفادہ کیا ہے ؛ کیونکہ واصل، ابوھاشم بن محمد حنفیہ بن علی علیہ السلام کا شاگرد کا تھا ۔

معتزلہ کو معتزلہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ "واصل" نے "منزلۃ بین المنزلتین" کا نظریہ پیش کر کے "حسن بصری" کے حلقہ درس سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی؛ تو حسن بصری نے کہا تھا " اعتزل عنّا واصل" ؛ البتہ بعض لوگ لفظ اعتزال کو ایک واقعہ سے نسبت دینے کے بجائے، اسے اس مکتب کی خصوصیت قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں : معتزلہ چونکہ مرتکب کبیرہ کو ایمان اور کفر دونوں سے منعزل اور کنارہ کش جانتے ہیں (منزلۃ بین المنزلتین) لہذا انہیں معتزلہ کہا گیا ہے ۔ البتہ معتزلہ اور بھی ناموں سے جانے جاتے ہیں؛ مثال کے طور پر : عدلیہ ، موحّدہ ، قدریہ ، اھل الحق ، ثنویہ ، معطلہ ، جھمیہ ، وعیدیہ وغیرہ۔۔۔ البتہ ان میں ہر نام ان پر صدق نہیں کرتا ۔

(مأخوذ از: فرھنگ عقائد و مذاہب اسلامی ؛ جعفر سبحانی ؛ ج ۴ ؛ بخش مکتب اعتزال ؛ انتشارات توحید)

[5]) تیسری صدی ہجری میں احمد بن حنبل کے ظہور سے پہلے، اہل حدیث کے پاس کوئی مدوّن اصول نہیں تھے ؛ لہذا بہت سے گروہ، اہل حدیث کے زمرہ میں شمار ہوتے تھے؛ جیسے : مرجئہ ، جہمیہ ، ناصبی ، خارجی ، قدری ، واقفی، قاعدی، وغیرہ۔۔۔ پھر احمد بن حنبل نے ایک جامع اصول مدوّن کرکے، سب کو اس کے تحت اکٹھا کر لیا؛ پھر وہ دیگر ناموں کے بجائے "حنابلہ" کے نام سے جانے جانے لگے؛ تقریبا ڈیڑھ سو سال تک حنبلی عقائد اپنے عروج پر رہے؛ جس میں عقل سے ٹکراؤ، سطحی باتیں، اور انتہائی سخت جمود پایا جاتا تھا ؛ لیکن ۳۰۵ ہجری قمری میں ابوالحسن اشعری کے معتزلہ سے کنارہ کشی اور حنبلی مذہب اختیار کرنے کے بعد، اشعری نے حنبلی مذہب کو عقل کے آئینہ میں ڈھالنا شروع کیا؛ حالانکہ اشعری نے اپنے آپ کو حنبلی بتایا، لیکن ان دونوں میں کافی فرق تھا؛ احمد بن حنبل عقل کے بالکل خلاف تھے؛ لیکن ابو الحسن اشعری چونکہ پہلے معتزلی تھے، لہذا اس کے بیانات میں عقل سے استفادہ کافی جھلکتا ہے؛ یہیں سے ایک نیا موڑ آیا اور حنبلی عقائد عقل کے سراسر خلاف ہونے، اور عقل کی شدید مخالفت کی بناپر بھلا دئے گئے اور اس طرح حنابلہ، اشاعرہ ہو گئے ۔ آٹھویں صدی ہجری میں " ابن تیمیہ حرّانی" نے احمد بن حنبل کے اسی عقائد کو مزید غلیظ انداز میں پھر پیش کیا؛ اس وقت تو اسے قطعی کامیابی نہ ملی، اور عالم اسلام کے تمام علماء نے اس کی شدید مخالفت کی؛ اور اس کی بد دہنی کی بنا پر اسے سزا ہو گئی ؛ لیکن بعد میں بارہویں صدی ہجری میں "محمد ابن عبد الوہاب" کو اپنی خاص افتاد کی وجہ سے شاذ و نادر اور انوکھے نظریات کی تلاش تھی؛ لہذا اس نے، ابن تیمیہ کو "شیخ الاسلام" کا لقب دیکر، اس کے عقائد کو سلف صالح کی پیروی قرار دیکر، ترویج کرنے لگا؛ جس کی بنا پر وہ مسلمانوں کو بے دھڑک کافر قرار دے کر، ان میں پھوٹ ڈالنے لگا؛ چنانچہ استعمار نے اسے اپنی سیاست کو نافذ کرنے کا بہترین مہرہ قرار دے کر، آل سعود کو لالچ کے بلبوتے اس کی حمایت پر اکسایا؛ اس طرح "سلفیت" کے لبادہ میں " وہابیت " کی ترویج کے لئے ساری طاقتیں اکٹھا ہو گئیں؛ اور مال، دولت، سیاست، طاقت، نیز استعماری حمایت کے بلبوتے، عالم اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی غرض سے، سلفیت کی ترویج تیزی سے ہونے لگی ۔

(مأخوذ از: فرھنگ عقائد و مذاہب اسلامی ؛ جعفر سبحانی ؛ ج ۱ ؛ بخش سوم ، اہل حدیث ؛ انتشارات توحید)

[6]) ان کے نزدیک خداوند عالم کے کچھ ایسے صفات ہیں جو قرآن اور حدیث میں بیان ہوئے ہیں جسے " صفات خبری " سے یاد کیا جاتا ہے؛ اور عقل کے ذریعہ انہیں نہیں سمجھا جا سکتا ہے ؛ جیسے: " وجہ " ، " ید " ، " عین " ، یا قیامت میں رؤیت ، یا عرش سے خدا کا نزول ، یا جہنم میں خدا کا پیر ڈالنا ، وغیرہ ۔ ۔ ۔

[7]) یہ لوگ صفات خبری کی توضیح و تفسیر کے سلسلہ میں یکساں نہیں ہیں؛ ان مختلف نظریوں میں سے یہ نظریے قابل ذکر ہیں:

۱۔ **تشبیہ و تجسیم** : ان کا ماننا ہے کہ ان صفات کو تاویل کیئے بغیر، ان کے لغوی اور مادی معنی میں ہی لیا جائے ! اس طرح وہ خداوند عالم کے لئے (نعوذ باللہ) ہاتھ، پیر، آنکھ، چہرہ، جسم، وغیرہ سب کے قائل ہیں !! آیۃ اللہ سبحانی کے بقول، انہیں مسلمان اور موحّد ماننا مشکل ہے ۔

۲۔ **توقف** : یعنی ان صفات کو بغیر تاویل کے، اسی لغوی معنی میں لیا جائے لیکن تشبیہ و تجسیم سے بچنے کے لئے اس کی کیفیت کو الغاء کر دیا جائے ! ظاہر سی بات ہے یہ نظریہ نہایت سطحی ہے ، کیونکہ حفظ معنائے لغوی اور الغاء کیفیت در حقیقت جمع بین نقیضین کے سوا کچھ نہیں !!

۳۔ **تفویض** : یعنی ان آیات کے معانی ہمیں نہیں معلوم ! ہم اس پر ایمان لاتے ہیں لیکن اس کے معنی خداوند عالم پر چھوڑ دیتے ہیں ! ۔ ۔ ۔ ! اس کا مطلب قرآن میں صفات کا ذکر، لقلقہ زبانی کے لئے، حل نہ ہونے والے معمّے کے طور پر ہوا ہے!!

(مأخوذ از: فرھنگ عقائد و مذاہب اسلامی ؛ جعفر سبحانی ؛ ج ۱ ؛ بخش سوم ، اہل حدیث ؛ انتشارات توحید)

حقیقت یہ ہے کہ " عقل کا معتبر ہونا " ایک ایسا مسئلہ ہے جو انسان کي فطرت میں شامل ہے، چاہے وہ عقل کي مخالفت ہی کیوں نہ کرے! کوئي انسان یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اس کے نظریات عقل کے سراسر برخلاف ہیں! کسی کے عقائد کو خلاف عقل کہہ کے دیکھئے تیوریاں چڑھ جائیں گی

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ وہ لوگ عقل کي مخالفت، عقل کے ہی ذریعہ کرتے ہیں! اور خود نہیں سمجھ پاتے کہ عقل کي مخالفت کرتے ہوئے بھی " اعتبار عقل "ہی کو ثابت کرتے ہیں۔!! ما لکم کیف تحکمون !"[8]

دیکھا گیا ہے وہی لوگ جو عقل کي مخالفت کرتے ہیں، اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لئے جہاں تک ممکن ہے، عقلي دلائل سے خوب استفادہ کرتے ہیں؛ اور اگر کہیں عقل کي مخالفت کرتے ہیں تو اس لئے کہ ایک طرف سے وہ ایک عقیدہ کو مان چکے ہوتے ہیں، دوسري طرف سے اس کو عقلي طور پر ثابت نہیں کر پاتے تو دیني اور عقیدتي لگاؤ یا تعصب کي بنا پر عقل کي مخالفت کرنے لگتے ہیں، ورنہ جہاں تک عقلي دلائل سے دفاع کر سکتے ہوں، خوب کرتے ہیں... یا دوسرے ادیان و مذاہب کو باطل قرار دینے کے لئے ان کے عقاید میں سے عقلي تناقضات کو پیش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے...

ظاہر سي بات ہے عقلي تناقضات کي بنا پر کسی عقیدہ کا باطل ہونا، اسي وقت ممکن ہے جب "عقل "معتبر ہو!! اگر مان لیا جائے کہ عقلي تناقضات کي وجہ سے کوئي عقیدہ باطل قرار پا سکتا ہے، تو جس طرح دوسروں کے عقیدے تناقضات کي بنا پر باطل ہو سکتے ہیں تو ظاہر سي بات ہے کہ خود اس کے بھی عقائد تناقضات کي بنا پر باطل ہونے چاہئے! یہ تو نہیں ہو سکتا کہ دوسروں کو باطل قرار دینے کے لئے ایک "معیار "معتبر ہو، اور اپنے لئے وہی معیار غیر معتبر!! اپنے آپ کو بچانے کے لئے عقل کي مخالفت، عاجزي کي دلیل ہے.

اعتبار عقل قرآن میں

آئے قرآن کریم کي رو سے دیکھتے ہیں کہ آیا عقل معتبر ہے یا نہیں؟ واضح رہے ہماري مراد، "دین" کے سلسلے میں ہے، ورنہ غیر دیني معاملے میں شاید ہی کوئي ایسا ہو جو عقل کو معتبر نہ جانتا ہو. قرآن کریم میں جگہ جگہ صاف طور سے عقل کو حجت قرار دیا گیا ہے؛ اور تمام انسانیت کو عقلي کاوشوں پر ترغیب دلاتے ہوئے دعوت فکر دي گئي ہے " انّ فی ذالک لآیات لقوم یتفکّرون..."؛[9] "انّ فی ذالک لآیه لقوم یتفکّرون...؛[10] "... لقوم یعقلون "[11] ؛ ... لقوم یفقهون [12] " ؛ "... لاولی الالباب" ؛ "... لاولی النّهیٰ " ؛ "... اولو الالباب " ؛...

---

[8]) یونس / ۳۵ ـ صافات / ۱۵۴ ـ القلم / ۳۶

[9]) الرعد / ۳ ـ الروم / ۲۱ ـ الزمر / ۴۲ ـ الجاثیة / ۱۳

[10]) النحل / ۱۱ و ۶۹

اور جو لوگ اپنی عقل پر پتھر ڈال کر کچھ غور و فکر و تامل سے کام نہیں لیتے قرآن کریم ان کی شدّت سے مذمت کرتا ہے؛" ذالک بانّھم قوم لا یقعلون "[13] ؛ "صم بکم عمی فھم لا یعقلون"[14] ؛ " لا یقعلون "[15] ؛ " اکثرھم لا یعقلون " [16] ؛ " افلا یعقلون"[17]...

قرآن کا لہجہ ان کی مذمت میں اور شدید ہوتا ہے" ا فلا یتدبّرون القرآن"[18] ؛ " افلا یتدبّرون القرآن ام علیٰ قلوبھم اقفالھا "[19] ... یہاں تک کہ انہیں حیوانوں کے زمرہ میں بھی سب سے بدتر شمار کرتا ہے " انّ شرّ الدّوابّ عند اللہ الصّم البکم الّذین لا یعقلون "[20] ...

قرآن کریم ایک مقام پر توحید کا اور قدرت الٰہی کا ایک دقیق مسئلہ سمجھاتے ہوئے آگاہ کرتا ہے کہ جو لوگ تعقل نہیں کرتے "رجس" اور پلیدی کا شکار ہو جاتے ہیں" و ما کان لنفس انّ تؤمن الّا باذن اللہ و یجعل الرّجس علیٰ الّذین لا یعقلون "[21] ...

بنیادي طور سے قرآن کي روش "دلیل" اور "برہان" کي ہے؛ قرآن ہر صاحبان عقیدت سے اپنے عقیدہ کے اثبات کے لئے برہان و دلیل طلب کرتا ہے " ھاتو برھانکم "[22] ؛ " ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین "[23] ... اور خود بھی اپنے مدعے کے لئے متقن دلائل پیش کرتا ہے، یونہی ماننے کے لئے نہیں کہتا " لو کان فیھما الھه الّا اللہ لفسدتا "[24]... قرآن کریم، عقل کو صرف حکمت نظري[25] کي حد تک ہی نہیں، بلکہ حکمت عملی[26] میں بھی عقل کو معتبر جانتے ہوئے افعال کے حسن و قبح عقلي کي طرف اشارہ کرتا ہے چنانچہ متعدد مقامات پر اپنی دعوت اور انبیاء کي بعثت کو "موعظہ" و "تذکر" (یاددہاني) قرار دیتا ہے یا اسے "امر بالمعروف اور نھی از

---

[11]) الرعد/ 4۔النحل/ 2و67 . العنکبوت/ 35 . الروم/ 24و28۔الجاثیۃ/5 . البقرہ/ ۱۶۴

[12]) الانعام / ۹۸

[13]) المائدۃ / ۵۸

[14]) البقرہ / ۱۷۱

[15])الانفال/ ۲۲۔یونس/42ص100 . الحشر/ ۱۳۔

[16]) المائدۃ/ ۱۰۳۔العنکبوت/ 63 . الحجرات/ ۴

[17]) یس / ۶۸

[18]) النساء / ۸۲

[19]) محمد / ۲۴

[20]) الانفال / ۲۲

[21]) یونس / ۱۰۰

[22]) الانبیاء / ۲۴ ۔ القصص / ۷۵

[23]) البقرۃ / ۱۱۱ ۔ النمل / ۶۴

[24]) الانبیاء / ۲۲

[25]) حکمت نظری، عقل نظری اور عقل محض سے نکلتی ہے ؛ جس میں فلسفہ، منطق، ریاضیات، طبیعیات، جیسے علوم شامل ہیں جو کہ صور معقولات پر مشتمل ہیں۔

[26]) حکمت عملی، عقل عملی سے نکلتی ہے؛ جس میں اخلاق، تدبیر معاش، سیاست، جیسے عملی علوم شامل ہیں؛ جن کا رابطہ عمل سے ہے اور جس کی بنیاد "حسن و قبح ذاتی و عقلی" پر ہے

منکر" کے عنوان سے یاد کرتا ہے" انّ اللہ یأمر بالعدل و الاحسان و ایتاء ذی القربیٰ و ینھیٰ عن الفحشاء و البغی یعظکم لعلکم تذکّرون "[۲۷] ؛ " یأمر ھم بالمعروف و ینھاھم عن المنکر "[۲۸]...

واضح سي بات ہے ''یادہاني'' اسي وقت ممکن ہے جب پہلے سے کوئي بات پتہ ہو اور کچھ وجوہات کي بناپر بھول یا غفلت کا شکار ہو گئي ہو....اور ''معروف'' یعني جاني پہچاني ہوئي چیز،اور ''منکر'' یعني وہ چیز جس سے انساني فطرت ناساگار ہے،اور انسان اس سے نفرت کرتا ہے۔لہذا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ قرآن نے الہی دعوت اور انبیاء کی بعثت کو یاد دھانی کا ذریعہ قرار دے کر، نیز امر بالمعروف اور نہی از منکر کا حکم دے کر، حسن و قبح عقلی کی طرف اشارہ کیا ہے؛ ورنہ یاد دھانی کا،اور معروف و منکر کا کوی معنی، مفہوم اور مطلب نہ ہوتا۔

حسن و قبح عقلی سے مراد یہ ہے کہ اچھائیوں کا "اچھا ہونا" اور برائیوں کا " برا ہونا" کسی کے اعتبار پر منحصر نہیں ہے بلکہ اچھائیوں کی اچھائیاں اور برائیوں کی برائیاں ذاتی ہیں اور عقل اسے درک کرنے میں مستقل ہے۔

اس کے مقابلہ میں اشاعرہ، حسن و قبح کو "عقلی" نہیں بلکہ "شرعی" مانتے ہیں؛ یعنی اچھا وہ ہے جسے شرع نے "اچھا" قرار دیا ہے اور بُرا وہ ہے جسے شرع نے "بُرا" قرار دیا ہے؛ اس میں عقل کا کوئی دخل نہیں ہے۔

گویا شریعت ظلم کا حکم دے سکتی ہے؛ ایسی صورت میں ظلم، قبیح نہ ہوگا بلکہ حسن اور قابل مدح وستائش ہوگا!! جبکہ حسن و قبح عقلی کے قائلین کا ماننا یہ ہے کہ خداوند عالم کو کہ قادر و حکیم و رحمٰن و رحیم ہے، کبھی کسی قبیح چیز کا حکم نہیں دے سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حسن و قبح کا مسئلہ ایسے بنیادی مسائل میں ہے جس پر علم کلام بلکہ دیگر علوم اسلامی منجملہ فقہ و سیاست و حقوق و اخلاق پر بہت سے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیۃ اللہ سبحانی نے اپنی کتاب "حسن و قبح عقلی" میں بہت سے اثرات کی طرف تفصیل سے روشنی ڈالی ہے؛ جس میں سے صرف چند نتائج کی طرف ہم یہاں اشارہ کر رہے ہیں:

ا۔ وجوب معرفۃ اللہ:

خداوند عالم کی معرفت حاصل کرنا، تمام متکلمین کے نزدیک واجب اور ضروری ہے؛ اشاعرہ اسے "شرعا" واجب سمجھتے ہیں تو عدلیہ یعنی معتزلہ اور امامیہ، خداوند عالم کی معرفت سے پہلے شرعی حکم کے نفاذ کو نامعقول قرار دیتے ہوئے خداوند عالم کی معرفت کو "عقلا" واجب قرار دیتے ہیں۔

---

[27]) النحل / ۹۰

[28]) الاعراف / ۱۵۷

عدلیہ، خداوند عالم کی معرفت کے وجوب کو عام طور سے دو عقلی دلائل سے استفادہ کرتے ہیں؛ جس کی بازگشت حسن وقبح عقلی کی طرف ہوتی ہے

أ: منعم کی پہچان، اور اس کا شکر ادا کرنا عقلی طور سے لازمی ہے (لزوم شکر منعم)

ب: قابل توجہ احتمالی خطرہ کا تدارک، عقل کا لازمی فیصلہ ہے (لزوم دفع ضرر مہم)

۲۔عدل الٰہی:

اس سلسلہ میں آیۃ اللہ سبحانی اپنی کتاب میں، کتاب انوار ملکوت فی شرح الیاقوت سے علامہ حلی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو نقل کرتے ہیں کہ "عدل الٰہی سے مربوط جملہ مسائل کی بنیادی جڑ اور ریشہ ای مسئلہ، خداوند عالم کی حکمت کی معرفت ہے؛ یعنی یہ کہ خداوند عالم، ہر گز قبیح چیز کو انجام نہیں دیتا اور نہ اس کا حکم دیتا ہے... اور چونکہ یہ مسئلہ، حسن وقبح عقلی پر مبتنی ہے، لہذا مصنف (یعنی ابو اسحاق ابراہیم بن نوبخت) نے حسن وقبح عقلی کی بحث کو پہلے بیان کیا ہے۔

۳۔ قاعدہ لطف:

قاعدہ لطف یعنی یہ کہ خداوند عالم پر لطف واحسان کرنا واجب اور ضروری ہے؛ یہ قاعدہ ایک عقلی قاعدہ ہے جس کی بازگشت حسن وقبح عقلی کی جانب ہوتی ہے۔ "قاعدہ اصلح" نیز "وجوب بعثت انبیاء" بھی اسی قاعدہ پر مبتنی ہے؛ لاہیجی، کتاب "سرمایہ ایمان" میں اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں: "اس مسئلہ پر مبنی ہے مسئلہ ثبوت نبوت اور علم کلام کے بہت سے مسائل"

اشاعرہ اس قاعدہ کے انکار میں کہتے ہیں کہ عقل اس سے کہیں قاصر ہے کہ خداوند عالم پر حکم لاگو کرے؛ اور اسے اپنے حکم کا تابع بنائے! جبکہ عدلیہ کے قول کے مطابق وجوب لطف کے سلسلہ میں عقل خداوند عالم پر کوئی حکم نافذ نہیں کرتی بلکہ اس کے جملہ تمام صفات کمال وجمال سے یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے اور اس حکم کو کشف کرتی ہے؛ یعنی عقل واضع حکم نہیں ہے بلکہ کاشف حکم ہے۔

علامہ حلی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ میں خواجہ نصیر الدین طوسی علیہ الرحمۃ کے قول کی تفسیر میں تحریر کرتے ہیں: اشاعرہ کے بر خلاف، ہمارے نزدیک "لطف" واجب ہے؛ اور دلیل یہ ہے کہ مکلّف کا ہدف اور مقصد اسی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، ورنہ نقض غرض پیش آتا ہے؛ لہذا لطف واجب ہے۔

۴۔انبیاء کی نبوت کی تصدیق:

آیۃ اللہ سبحانی، حسن وقبح عقلی کے اثرات کو بیان کرتے ہوئے اس اہم اثر کی جانب یوں اشارہ کرتے ہیں: "صاحب معجزہ انبیاء کی نبوت کی تصدیق کا سرمایہ اور اس کی بنیادی دلیل، حسن وقبح عقلی ہے۔

۵۔اقدار واخلاق حسنہ کا سرچشمہ:

دنیا بھر کے ہر مذہب وملت میں، ظلم، جھوٹ، فریب، جنگ وجدال، نفرت، حسد، غرور، گھمنڈ جیسی تمام چیزیں منفور ومذموم مانی جاتی ہیں؛ تو عدل وانصاف، صلح و آشتی، سچّائی، محبت، اخوت، مروت، شجاعت، ایک دوسرے کا خاص کر بڑوں کا احترام، ھمدردی، تعاون جیسے تمام اخلاق حمیدہ، دنیا کے ہر انسان کے نزدیک محبوب، پسندیدہ اور قابل مدح وستائش ہیں۔

قوم، مذہب، ملت، دین، آئین کے اخلاف کے باوجود، یہ یکسانیت بتارہی ہے کہ اس کا سرچشمہ "حسن وقبح ذاتی اور عقلی" ہے۔

حسن وقبح عقلی کے اثرات کی فہرست بہت لمبی ہے؛ جس میں سے اکثر مباحث فنّی ہیں؛ منجملہ: "قبح تکلیف مالایطاق"، "قبح عقاب بلا بیان"، "قبح عقاب غیر مکلّف"، "حسن ہدایت"، "قبح ضلالت"، "مسئلہ شرور عالم"۔ . . حقیقت یہ ہے کہ یہ موضوع، مستقل ایک ضخیم کتاب کا موضوع ہو سکتا ہے تاکہ جملہ تمام اثرات کی طرف تفصیل سے روشنی ڈالی جاسکے؛ ہم یہاں اختصار کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اس بحث پر یہیں اکتفاء کرتے ہوئے، حسن وقبح عقلی کے قائلین اور منکرین کے دلائل کی طرف مختصر اشارہ کیا جارہا ہے۔

قائلین کے دلائل:

أ: حسن وقبح "عقلی" کا انکار، "شرعی" کے انکار کے مساوی ہے؛ کیونکہ حسن وقبح عقلی کا انکار کرکے، شریعت کا اثبات ناممکن ہے؛ اگر ہم حسن وقبح عقلی کو قبول کرلیں تو نبوت حقہ اور شرایع الٰہیہ کے اثبات میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

ب: حسن وقبح عقلی کے انکار کا لازمہ اس کے بر خلاف کو بھی تسلیم کرنا ہے؛ علاّمہ حلی علیہ الرّحمۃ اس کی وضاحت یوں پیش کرتے ہیں: حسن وقبح عقلی کے انکار کا لازمہ یہ ہے کہ جس چیز کو ہم "حسن" تسلیم کرتے ہیں لازمی طور سے اسے "قبیح" بھی تسلیم کریں! اور اسی طرح برعکس!! ظاہر سی بات کہ یہ اجتماع نقیضین ہے اور محال۔

ج: حسن وقبح کا ادراک، نوع انسانی کا لازمہ ہے، لہذا یہ مسئلہ بدیہیات عقلیہ، وجدانیات اور اوّلیات میں سے ہے۔

منکرین کے دلائل، مع نقد:

أ: حسن وقبح عقلی، خداوند عالم پر حکم لگانے کے مترادف ہے اس کا لازمہ خداوند عالم کی قدرت کاملہ کو محدود کرنا ہے۔

نقد: اس کا جواب (جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان ہوچکا ہے) یہ ہے کہ عقل، "واضع" نہیں ہے بلکہ "کاشف" ہے؛ لہذا نہ خداوند عالم پر حکم لاگو کرنے کا مسئلہ پیش آتا ہے نہ ہی خداوند عالم کی قدرت محدود ہوتی ہے۔

ب: خداوند عالم نے رسولوں کے ذریعہ اپنی حجت کو قائم کیا ہے، نہ کہ عقل کے ذریعہ؛ارشاد باری تعالیٰ ہے "مَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبعَثَ رَسُولًا" اگر حجت، عقل کے ذریعہ قائم ہو سکتی تو خداوند عالم، عذاب کو بعثت رسول پر معلّق نہ کرتا؛ بلکہ عقل پر۔

نقد: خود بعثت انبیاء بھی حسن ہدایت، قبح ضلالت، اور وجوب لطف پر مبتنی ہے جو کہ حسن و قبح ذاتی اور عقلی کی فروعات میں سے ہے؛اس کے علاوہ رسالت انبیاء کی تصدیق بھی حسن و قبح ذاتی و عقلی کے انکار کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔

رہ گئی بات یہ کہ خداوند عالم بعثت انبیاء کے ذریعہ اپنی حجت کو قائم کیا ہے، نہ کہ عقل کے ذریعہ؛تو اس بات کو یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ بندوں پر خداوند عالم کی حجت دو طرح کی ہیں: ۱) حجت باطنی: جو کہ عقل ہے۔ ۲) حجت ظاہری: جو کہ خداوند عالم کی جانب سے بھیجے ہوئے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء اور ان کے اوصیاء و اولیاء ہیں؛ ان لله على الناس حجتين،حجه ظاهرة و حجه باطنه، فاما الظاهرة فالرسل والانبياء والائمه عليهم السلام ؛واما الباطنه فالعقول [29] جب حجت ظاہری کا ظہور ہوتا ہے تو حجّت باطنی، حجت ظاہری کی تصدیق کرتی ہے الحجه على الناس اليوم العقل، يعرف به الصادق على الله فيصدّقه، و الكاذب على الله فيكذبه [30] اس طرح حجّت ظاہری یعنی بعثت انبیاء کے ذریعہ حجت کامل ہو جاتی ہے اسی لئے خداوند عالم نے اس جزء اخیر، جزء مکمل اور جزء اہم کی طرف اشارہ کیا ہے؛نہ یہ کہ عقل کی حجیت کو باطل قرار دیا ہو، بلکہ عقل کی حجیت، اصیل اور ذاتی ہے؛ حجه الله على العباد النبى، و الحجه فى ما بين العباد و بين الله العقل [31] اس طرح انبیاء کی حجیت اور عقل کی حجیت میں کوئی منافات نہیں ہے۔

حسن و قبح عقلی کے قائلین نیز منکرین کے دلائل اور بھی ہیں منجملہ یہ کہ: اگر کسی نے وعدہ کر لیا کہ کل فلاں قبیح کام انجام دونگا؛تو ایسی صورت میں اگر وعدہ کے مطابق انجام دے تو قبیح؛اور اگر وعدہ کے بر خلاف انجام نہ دے تو بھی قبیح ہوگا! مگر یہ کہ یہ مان لیں کہ خلف وعدہ ہمیشہ قبیح نہیں ہے؛ایسی صورت میں حسن و قبح کا ذاتی ہونا خطرہ میں پڑ جائے گا...

یا یہ کہ: جھوٹ ہمیشہ قبیح نہیں ہے جیسے کسی نبی کی جان بچانے کے لئے مصلحت آمیز جھوٹ بولنا؛اگر جھوٹ کا قبح ذاتی ہوتا تو کسی حالت میں بھی قابل مدح نہ ہوتا بلکہ ہر حالت میں قابل مذمت ہوتا، لیکن مذکورہ مثال میں جھوٹ قابل مذمت نہیں بلکہ قابل مدح و ستائش ہے...

---

[29]) کافی، ج۱، کتاب العقل، ص۶۱

[30]) گذشتہ منبع، ۲۵

[31]) گذشتہ منبع، ۲۹

بھر حال اس طرح کے اور بھی دلائل ہیں؛ جنہیں "دلائل" کہنا شاید درست نہ ہو کیونکہ یہ شبہات اور مغالطات سے زیادہ مشابہ ہیں بہ نسبت منطقی دلائل کے۔ اور علماء نے ان شبہات کا مختلف طریقوں سے، کبھی "اہم" و "مہم" کے امتیاز کے ذریعہ تو کبھی "حسن و قبح فعلی" اور "حسن و قبح فاعلی" کے فرق کے ذریعہ متقن اور مستدل جواب دیا ہے۔

گفتگو اس بارے میں تھی کہ قرآن کریم نے عقل کی حجیت کا، چاہے نظری ہو یا عملی، اپنی متعدد آیات میں وضاحت کے ساتھ اعلان کیا ہے۔

قرآن میں کہاں کہاں عقل کے سلسلے میں کیا کہا ہے یہ پوری ایک ضخیم کتاب کا موضوع ہو سکتا ہے. مختصر یہ کہ قرآن میں لفظ "عقل" 48 مرتبہ اور اس سے ملتے جلتے الفاظ بھی متعدد بار استعمال ہوئے ہیں؛ جس سے قرآن کی نظر میں عقل و فکر و تأمل و تدبّر کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے.

قرآن کریم میں یہ الفاظ کتنی بار استعمال ہوئے ہیں درج ذیل ارقام ملاحظہ ہوں:

عقل.....48 مرتبہ

اولوالالباب (صاحبان فہم)..... 16 مرتبہ

تفکر..... 18 مرتبہ

فقہ و تفقہ (باریک بینی اور دقت نظر)..... 19 مرتبہ

یقین (اور مشتقات)..... 28 مرتبہ

حکمت (اور مشتقات)..... 204 مرتبہ

حق (اور مشتقات).....261 مرتبہ

علم (اور مشتقات)..... 902 مرتبہ

قرآن کریم میں عقل کی اس قدر اہمیت کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی عقل کی مخالفت نہیں کر سکتا مگر یہ کہ تعصب، ہٹ دھرمی، کٹّرپنتی، انتہا پسندی پر اتر آئے؛ تو پھر اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

تعقل سے مراد تجربہ اور حسّ

حالیہ دور میں عقل کی مخالفت میں ایک نیا نظریہ ظاہر ہوا ہے؛اور وہ مغرب سے عالم اسلام میں پھیلا ہے؛ جس میں عقلی کاوشوں کے قرآنی حکم کو ایک خاص معنی دیکر اسے موڑ دیا گیا ہے؛اور اس طرح تعقل کو مان کر بھی تعقل کا انکار کیا گیا ہے۔

دراصل "کینٹ" کے فلسفہ کے بعد،(جس میں اس نے عقل نظری یا عقل محض یا عقل ماوراء الطبیعہ کو ناکارآمد ثابت کر کے صرف تجربہ اور حس کی حد تک مطمئن ذریعہ قرار دیا ہے) مغرب میں تمام علوم کی اساس تجربہ اور حسی روش بن گئی... ظاہر سی بات ہے علوم تجربی میں یہی روش کارآمد بھی ہے؛ لیکن اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں ہے کہ ہر علوم میں یہی روش اپنائی جائے؛ بہر حال مغرب میں علوم تجربي اور حسي روش كي زبردست كاميابي سے متاثّر ہو کر بعض معاصر اسلامی دانشمندوں کا خیال ہے کہ دین میں عقلي كاوشيں ہو سکتی ہیں لیکن صرف طبیعیات اور مخلوقات میں تجربي اور حسي مطالعات کے ذریعہ ممکن ہے.

وہ اس طرح کہ یہ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے... یہ سب خدا کي آیات ہیں؛ان کے مطالعہ سے خدا كي معرفت میں اضافہ ہوتا ہے؛قرآن کریم انہیں آیات الٰہیہ میں تعقل و تفکر كي دعوت دیتا ہے. ابوالحسن ندوي، محمد قطب اور تحریک اخوان المسلمین کے مفکرین بھی اسي نظریہ کے حامل ہیں.

"ندوي" اپنی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين ''میں رقم طراز ہیں:

انبیاء كي تعلیمات کے مقابلے میں ذات وصفات خداوند...، آغاز وانجام جہان...، اور انسان کے مبدء ومعاد... یا ان جیسے مسائل کے بارے میں عقلي و فلسفي بحث کرنا ایک طرح كي ناشكري ہے۔

انبیاء نے اس بارے میں بہترین اور اعلیٰ تعلیمات سے بشریت کو بغیر کسی زحمت کے نواز دیا ہے؛

اب ان مسائل میں عقلي بحثیں بگھاڑنا جن کے مقدمات اور بنیادي مسائل ہماري محسوسات کے دائرے سے پرے ہیں ایک ایسے اندھیرے اور غیر معلوم راستہ پر قدم رکھنے کے مترادف ہوگا، جس کا نتیجہ سوائے گمراہی کے اور کچھ نہیں !

ظاہر سي بات ہے یہ نظریہ سلفیہ اور اہل حدیث جیسوں کے نظریہ سے کہیں بہتر ہے، اس لئے کہ یہ لوگ ایک گونہ تعقل کو مانتے ہیں، اور اس كي حجیت کو قبول بھی کرتے ہیں، لیکن ظاہراً ان کی بھی مثال ''آسمان سے گرے اور کھجور پہ اٹکے'' والی ہے؛ جو ایک مصیبت سے نکل کر دوسری مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔

تجزیہ، تحلیل اور نتیجہ

ان کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے کہ بے شک قرآن کریم نے مظاہر قدرت میں مطالعہ حسي کرنے كي بہت دعوت دي ہے، زمین وآسمان، چاند، ستارے، چرند وپرند یہاں تک چیونٹی، مکھي، مکڑي جیسے حشرات كي خلقت کے بارے میں غور وخوض، فکر وتامل کرنے كي ترغیب دلائي ہے.

لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآن کریم نے ایک طرف سے ایسے معارف بھی بیان کئے ہیں جو مطالعہ حسي سے کبھی سمجھ میں نہیں آ سکتے، ان کو سمجھنے کے لئے بہر حال ماوراء طبیعي مفاہیم کي ضرورت ہے.

دوسري طرف قرآن کریم نے بہت سے معارف اور عقاید کے اثبات کے لئے فلسفي برہان کي روش سے استفادہ بھی کیا ہے، جیسے '' لو کان فیهما آلهه الا الله لفسدتا ''. [۳۲]

اس آیت میں قرآن کریم نے خداوند عالم کی وحدانیت کے بارے میں صرف اعلان نہیں، بلکہ استدلال پیش کیا ہے؛ وحدانیت کو یونہی مان لینے کو نہیں کہا ہے؛ بلکہ استدلال پیش کر کے عقل کو دعوت فکر دی ہے؛ استدلال یوں ہے:

اگر خداوند عالم کے علاوہ اور بھی خدا ہوتے تو یقیناوہ آپس میں ایک دوسرے کے مغایر ہوتے؛ کیونکہ اگر مغایرت نہ ہو تو تعدد کا مفہوم ناتمام ہے؛ پھر وحدت اور تعدد میں کیا فرق رہے گا؟! تو معلوم یہ ہوا کہ تعدد کا لازمہ، ذات میں مغایرت ہے؛ اور مغایرت کا لازمہ، ارادہ وتدبیر میں اختلاف ہے؛ اور ارادہ وتدبیر میں اختلاف کا لازمہ، عالم کون ومکاں میں ناہماہنگی، بے ربطی، بے نظمی اور آخر کار فساد ہے۔

جبکہ عالم کون ومکاں ایسا نہیں ہے؛ بلکہ اس میں انتہائی گہرا اور عمیق ربط وضبط و نظم پایا جاتا ہے؛ اس کے ہر جزء ایک دوسرے سے ہماہنگ ہیں؛ اور ان میں ایک جامع قانون حکمفرما ہے؛ سائنس جتنا ترقی کر رہی ہے اتنا ہی اس کے نظم وربط وضبط وہماہنگی کی گہرائی کی تہوں کو آشکار کر رہی ہے

تو نتیجہ یہ نکلا کہ عالم کون ومکاں جو کہ فاسد نہیں بلکہ انتہائی نظم کے ساتھ اپنے بنائے گئے قانون پر گامزن ہے، اس کا خالق، مالک اور مدبر متعدد نہیں ہو سکتا بلکہ ایک ہے۔

دھیان رہے کہ یہ برہان، حسّی نہیں ہے؛ ہاں اس برہان کا جزء اخیر حسی ضرور ہے؛ یعنی ہم حس کے ذریعہ اس عالم کے فاسد نہ ہونے اور اس میں ایک خاص منظم اور جامع قانون کی حکمفرمائی کو مشاہدہ کر سکتے ہیں؛ لیکن یہ برہان کا صرف ایک جزء ہے؛ اس سے قطع نظر کہ خود حس بھی ہر چیز سے پہلے بنیادی طور سے بعض ماوراء حس، "علیّت"، "سنخیت"، جیسے عقلی اور فلسفی مفاہیم کا محتاج ہے؛ اس کے علاوہ صرف اس سے وحدانیت کا نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا؛ بلکہ اس جزء میں عقلی تجزیہ و تحلیل سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے؛ اور یہ محض عقلی اور فلسفی روش ہے؛ نہ کہ حسّی۔

معرفت خدا کے لئے مظاہر قدرت میں مطالعہ حسي کي روش سے استفادہ کرنے کو علم کلام میں ''برہان نظم'' سے یاد کیا جاتا ہے۔

---

[32]) الانبیاء / ۲۲

یہ روش نہایت آسان، سادہ، روشن اور عام فہم ہے، اسي لئے اس روش کو کافي مقبولیت حاصل ہے۔ لیکن برہان نظم کا بھی صرف ایک ہی جزء حسّی ہے؛ اور صرف اسی جزء سے نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا؛ اس برھان میں بھی جو نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ عقل محض اور فلسفی مفاہیم سے لیا جاتا ہے۔ بنیادی طور سے خود حسّی روش بھی علّت و معلول کے ایک خاص قانون کے تابع ہے؛ جو کہ محض عقلی اور فلسفی قانون ہے؛ اگر وہ تمام نہ ہو اور اسے بنیادی طور سے نہ مانا جائے، تو خود حسّی روش بھی نا قابل قبول ہو گی؛ لہذا برہان نظم میں مطالعہ حسّی، سابقاولاحقا، عقل محض اور مفاہیم فلسفی کا محتاج ہے۔

اس کے علاوہ صرف برہان نظم کافي نہیں ہے؛ برہان نظم کے سہارے رہرو، راہِ مستقیم کي صرف پہلی منزل سے آشنا ہو سکتا ہے۔ اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے، ہمیں بہر حال برہاني اور عقلي روش کا سہارا لینا پڑے گا۔ اس لئے کہ وہ محسوسات سے پرے ہے اور اس کو درک کرنے کے لئے ماوراء طبیعي مفاہیم کي بہر حال ضرورت ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ روش کافي نہیں ہے تو قرآن نے اس قدر تاکید کیوں کي ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ چونکہ یہ روش نہایت آسان اور عام فہم ہے لہذا یہ روش نہایت مناسب ہے کیونکہ خداشناسي تو ہر انسان کي فطرت میں شامل ہے بس اس فطرت کو ذرا سا اشارہ چاہیے پھر فطرت، انسان کو خود صدا دي گي کہ اے انسان! اپنے خدا کو پہچان...

اس کے علاوہ قرآن کریم میں بہت سی ایسی آیات ہیں جن کے مفاہیم ماوراء حس و تجربہ ہیں؛ مثال کے طور پر: هُوَ الاوّلُ وَ الآخِرُ وَ الظّاهِرُ وَ البَاطِنُ وَ هُوَ عَلی کُلِّ شَیءٍ عَلِیم [33] ... اس جیسی آیات قرآن میں فراوان ہیں جس میں ذات و صفات خداوند...، آغاز و انجام جہان...، اور انسان کے مبدء و معاد... یا ان جیسے مسائل کے بارے میں تعلیمات دی گئی ہیں.

اب دو ہی صورت ہے:

(الف) یا تو ان مفاہیم کو غیر قابل حل مجہولات کي صورت میں مان لیا جائے، اور یہ کہیں کہ قرآن نے انسانوں پر رعب ڈالنے کے لئے، اور انہیں قرآن کا جواب لانے سے عاجز کرنے کے لئے، کچھ ایسے معمّے پیش کئے ہیں جو کسی سے حل نہیں ہو سکتے! لہذا ہمارا وظیفہ یہ نہیں کہ ہم انہیں سمجھنے کي کوشش کریں بلکہ ہمیں یونہی بس مان لینا چاہیئے!!

(ب) یا یہ مانیں کہ خداوند حکیم نے قرآن مجید میں ان معارف کو ہماري ہدایت کے لئے بیان کیا ہے؛ تو قابل فہم بھی ہو گا؛ لہذا ہمارا فریضہ یہ ہے کہ اسے سمجھیں... معرفت حاصل کریں... اس پر عمل کریں اور ہدایت و سعادت کي منزل کو پا لیں۔

---

[33])الحدید/ 3

پہلا فرضیہ محال ہے اس لئے کہ خود قرآن نے ہمیں تعقل وتدبر و تفکر کي دعوت دي ہے۔اور یہ نہیں کہا ہے کہ اس میں تفکر کرو اور اس میں نہ کرو . (یعني مطلق بیان کیا ہے اور تفصیل کا قائل نہیں ہوا) .

البتہ یہ ضرور ہے کہ محض برہاني، عقلی اور فلسفی روش سخت اور دشوار ہونے کي وجہ سے بہت زیادہ عام نہیں ہے، عوام اسے آساني سے نہیں سمجھ پاتے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی کے نہ سمجھنے سے کوئي چیز باطل نہیں ہوتي، عوام نہیں سمجھتے؛ عوام میں مقبول نہیں ہے؛ لیکن معاشرہ کے پڑھے لکھے افراد، عقلي اور فلسفي براہین کو نہ صرف سمجھتے اور پسند کرتے ہیں بلکہ ان کي ضرورت بھی ہے کیونکہ یہ لوگ دوسرے مختلف مکاتب فکر سے آشنا ہوتے ہیں اور ہر مکتب فکر کی مشترک زبان، عقل ہے؛ مشترک استدلال صرف عقلی استدلال ہے؛ کیونکہ ہر مکتب کا تصور کائنات جدا ہوتا ہے، لہذا تمام مکاتب فکر کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ان کے لئے بہت سے ایسے سوالات ابھرتے ہیں جن کا جواب سوائے عقلي اور فلسفي استدلال کے ذریعہ نہیں دیا جاسکتا .